جماعتوں، اور بعض اوقات متضاد و متناقض رُجحانات میں مصالحت و مفاہمت کی کامیاب کوشش، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کا مولانا رُومؒ کی اس حکیمانہ وصیت پر پورا عمل تھا ؎ تو برائے وصل کردن آمدی :: نے برائے فصل کردن آمدی

نیز خواجہ حافظؒ کے اس شعر پر بھی وہ پورے طور پر کاربند تھے ؎
آسائشِ دو گیتی تفسیر این دو حرف است :: با دوستان تلطّف با دشمناں مدارا

بارہا اس کا تجربہ ہوا کہ مختلف نقطۂ نظر پوری خطابت اور زورِ استدلال کے ساتھ سامنے آئے، اور نظر آنے لگا کہ شاید آستینیں چڑھ جائیں۔ کہ مفتی صاحب کے چند فقروں نے اس جوش کو ٹھنڈا کر دیا۔ مختلف جماعتوں کو ساتھ لے کر چلنے کی جیسی صلاحیت ان میں دیکھی گئی، کم قائدین میں دیکھنے میں آئی ممکن ہے بعض "ماہرینِ نفسیات" اور ناقدین اس کو ان کی کمزوری اور ضرورت سے زیادہ بڑھی ہوئی خوش خلقی و مروّت پر محمول کریں، لیکن جب ملّت میں انتشار ہو مختلف جماعتیں اور مکاتبِ خیال کسی نہ کسی درجہ میں عصبیّت سے متاثر ہوں تو ایسی "مرنجان و مرنج"، حلیم و بردبار اور دبے ہوئے شخصیت کی ضرورت شدت سے محسوس کی جاتی ہے، اور آج یہ خلا مفتی صاحب کے انتقال کے بعد نہ صرف مجلس مشاورت کے دائرہ میں (جس کا منصبِ صدارت ابھی تک خالی ہے) بلکہ ملّت کے دائرہ میں بھی محسوس ہوتا ہے۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے اتنا عرض کرتا چلوں کہ مجلس کے طویل و وسیع دوروں میں میں دو باتوں کی خاص کوشش کرتا تھا، ایک یہ کہ قیام (علمی، دینی اور طبعی مناسبت کی وجہ سے) ہمیشہ مفتی صاحب کے ساتھ رہے، دوسرے نمازیں (خصوصاً جہری) انھیں کی امامت اور اقتدا میں پڑھی جائیں، اس لئے کہ مفتی صاحب کی تلاوت میں بڑی حلاوت تھی، وہ بھی رفقاء سفر میں مجھ پر خاص طور پر شفقت

فرماتے تھے، اور مانوس و بے تکلف تھے، اسی تعلق و محبت کی بنا پر میری درخواست پر ۱۹۷۵ء میں وہ رائے بریلی تشریف لائے اور واپس جاکر بڑی محبت کا خط لکھا جس کے لفظ لفظ سے خلوص و مسرت کا اظہار ہوتا ہے۔

مفتی صاحب کی محبت اور تعلق کی بات تھی کہ انھوں نے کئی بار مجھ سے فرمایا کہ تم اپنی کوئی تصنیف ندوۃ المصنفین کو دو، اور اس کی طرف سے اسکی اشاعت ہو ۱۹۷۸ء کی ابتدا کا کوئی مہینہ تھا، کہ تذکیر بجرات میں محترمی مولانا غلام محمد صاحب نورگت کے دولت خانہ پر جن کا مفتی صاحب سے خاص تعلق تھا، اور میرے بھی بزرگ اور کرم فرما ہیں، اس کا ذکر آیا، اور میں نے اپنی کتاب سعیات عبدالحیؒ جو انھیں دنوں میں مرتب و مکمل ہوئی تھی۔ ندوۃ المصنفین کو پیش کرنے کا وعدہ کیا مفتی صاحب نے اس پر اپنی بڑی خوشی کا اظہار کیا اور بڑی توجہ اور اہتمام کے ساتھ وہ نومبر ۱۹۷۸ء میں ندوۃ المصنفین کی طرف سے شائع ہوگئی، مجھے بھی مفتی صاحب کی ایک خواہش و فرمائش کی تعمیل کی مسرت و سعادت اور کتاب کو ندوۃ المصنفین جیسے موقر تصنیفی ادارہ کی مطبوعات میں شامل ہونے کی عزت حاصل ہوئی، اور وہ الحمدللہ علمی ادبی حلقوں میں پسند کی گئی، مفتی صاحب کی اجازت سے ادارہ نشریات اسلام نارتھ ناظم آباد نے اس کا پاکستانی ایڈیشن بھی شائع کیا۔

مفتی صاحب اخیر میں چند شدید بیماریوں کا شکار رہے، لیکن مزاج میں جو مروت اور لینت، پرانے تعلقات کا پاس و لحاظ اور اخلاق و ایثار کا جوہر تھا وہ ضروری آرام و احتیاط میں بھی مخل ہوجاتا تھا، یہی وجہ تھی کہ انھوں نے اپنے بہت سے قدیم عوارض اور جدید تکلیفوں کے باوجود دارالمصنفین کے اس سمینار میں شرکت ضروری سمجھی جو اسلام اور مستشرقین کے عنوان پر ۲۶ - ۲۸ ربیع الآخر ۱۴۰۲ھ ۲۱ - ۲۳ فروری ۱۹۸۲ء کو دارالمصنفین کی طرف سے اس کے زیر اہتمام

شبلی نیشنل پوسٹ گریجویٹ کالج اعظم گڑھ میں منعقد ہوا، اسی سفر سے واپسی پر دریاآباد کے اسٹیشن پر ان پر اچانک فالج کا حملہ ہوا، یہ انتظام غیبی تھا کہ مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی اور چند مخلص احباب و رفقاء خاص ہمسفر تھے، لکھنؤ کے طبی امداد کے اسٹیشن پر پہونچ جانے کی اطلاع کردی گئی، وہاں مفتی صاحب کو اتارلیا گیا، مفتی صاحب کے نیازمندوں اور ندوۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے احباب وخدام نے اپنی ذمہ داری کا پورا احساس کیا، اور حصول سعادت اور خدمت کو غنیمت سمجھا، راقم سطور بھی لکھنؤ میں موجود تھا، وہ بھی اس سعادت میں شریک رہا، مفتی صاحب کو بلرام پور ہسپتال میں داخل کردیا گیا دارالعلوم کے اساتذہ اور طلبہ نے دین وملت کے اس "ہُما"، کی پذیرائی میں کوتاہی نہیں کی، جو قسمت سے اڑکران کے پاس پہونچ گیا تھا، خیال تھا کہ جب تک آرام نہ ہوجائے مفتی صاحب یہاں سے تشریف نہ لے جائیں، لیکن گھروالوں کا تقاضہ غالب آیا اور یہ خیال ہوا کہ ان کا حق زیادہ ہے اور شاید وہاں مفتی صاحب کو قلبی وروحانی سکون اور طمانینت ملے اس لئے بادل ناخواستہ یہ جدائی گوارا کی گئی، لیکن کچھ عرصہ کے بعد ہی وہ ساعت مقرر آگئی، جس کے متعلق فرمادیا گیا ہے کہ

لا یستأخرون ساعۃ ولا یستقدمون

اور نہ صرف ندوۃ المصنفین بلکہ وہ سب دینی ادارے جس کے وہ رکن ومشیر اور معاون ورفیق تھے، نہ صرف دہلی جوان کا مسکن اور دیوبند جوان کا وطن تھا، بلکہ برصغیر ہند (ہندوستان وپاکستان) ان کی رہنمائی، اصابت رائے سلامت فہم، اور مختلف الخیال لوگوں میں وصل وجمع کی صلاحیت سے محروم ہوگیا، رحمہ اللہ رحمۃ واسعۃ

مفتی صاحب کے لئے تقدیر الٰہی میرے لئے توفیق وسعادت کی بات

تھی کہ مفتی صاحب کی وفات کا واقعہ پیش آیا تو میں حجاز مقدس میں تھا) مجھے دہلی کے ٹیلیفون سے اس کی بروقت اطلاع ملی، میں نے اسی وقت سعودی ریڈیو اسٹیشن سے رابطہ پیدا کیا اور عزیزی مولوی نصار رفیع ندوی انچارج شعبۂ اردو جدہ ریڈیو اسٹیشن کو اپنی قیام گاہ پر بلاکر مفتی صاحب کے حادثہ ارتحال اور ان کی شخصیت، خدمات وکمالات پر ٹاک ریکارڈ کرائی، جو اسی دن نشر ہوئی اور اسی کے ذریعہ حجاز مقدس اور سعودی عرب کے دوستوں اور اہل تعلق کو حادثہ کا علم ہوا مجھ سے جو کچھ بن آیا مفتی صاحب کے رفع درجات کے لئے دعا اور طواف کی سعادت حاصل کی اور اپنے مخلص احباب کو بھی اس کی ترغیب دی۔ اندازہ ہے کہ بہت سے مخلصین نے یہ سعادت حاصل کی، اور مفتی صاحب کے لئے دعا وطواف کے ذریعہ ایک جلیل القدر عالم اور خادم ملت کے لئے دعا اور ایصال ثواب کرکے اپنے لئے بھی قبولیت اور ترقی دینی کا سامان کیا، شاید کم مشاہیر وزعماء کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا ہو، کہ اس قدر جلد ان کے لئے دیار مقدسہ میں دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کا اہتمام ہوا ہو۔

وذٰلك فضل اللّٰه يؤتيه من يشاء ـــــ

The Saudi Arabian Ambassador

Dear Madame, 15th May 1984.

I noted with deep grief and sorrow, the demise of your late husband Mufti Atiqur Rehman.

I express my deep sorrow and sincere condolences to you and the family members on this irreparable loss of a great man who had rendered innumberable services to Islam and to the muslims.

I pray to God that his soul may rest in peace.

Yours sincerely,

F. S. Hussaini

Fouad S. Husseini

TO:

Mrs. Atiqur Rehman
Maktaba Burhan
Urdu Bazar
Delhi-110006

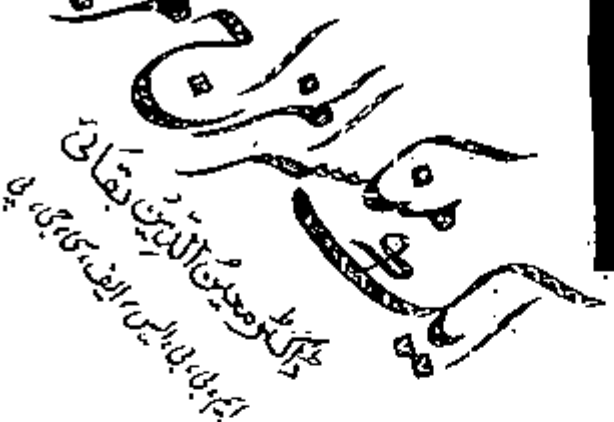

مفتی صاحب

ایک منفرد شخص

ڈاکٹر معین الدین بقائی
ایم بی بی ایس، ایف سی جی پی

پر وقار شخصیت، سفید لباس، مناسب قد، سیاہ اونچی باڑ کی ٹوپی، پیکر اخلاق یہ تھی مفتی صاحب کی شخصیت، جیسا کہ سب سے پہلے بچپن میں میں نے انھیں دیکھا یہ غالباً ۳۵، ۳۶ سال پہلے کی بات ہے میرے والد حکیم شریف الدین بقائی صاحب کے پاس دواخانے میں اکثر حضرت تشریف لاتے اور نہایت متانت اور سنجیدگی کے ساتھ مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی، دوران گفتگو کبھی میں نے مفتی صاحب کو تیز آواز میں بولتے یا ہنستے نہیں دیکھا، مجھ سے بھی نہایت مشفقانہ انداز میں خیریت دریافت کرتے، میرے دل میں حضرت کیلئے بیحد احترام اور محبت پیدا ہو گئی۔ میں اسکول کی منزلوں سے گذر کر کالج تک پہونچا، پری میڈیکل کے بعد میڈیکل کالج میں داخلے کے لئے مختلف جگہوں پر درخواستیں اور کوششیں کیں، یہ اگست ۱۹۶۵ء کی بات ہے، اچانک ہندوستان اور پاکستان میں کشمیر کے مسئلہ کو لیکر اختلافات شروع ہو گئے۔ اور اگست کے آخیر میں پہلی ہند پاک جنگ شروع ہو گئی جس میں ہندوستان نے لاہور پر اور پاکستان نے کشمیر پر حملہ کر دیا۔ ۲ر ستمبر ۶۵ء کو کشمیر میڈیکل کالج سے داخلے کی اطلاع بذریعہ ٹیلیگرام موصول ہوئی دل کی کیفیت عجیب کہ داخلہ بھی ملا تو ایسی حالت میں کہ گھر والے کسی قیمت پر بھی نہیں راضی ہونگے، ۵ر ستمبر کو جنگ بندی ہوئی اور ستمبر کے دوسرے ہفتے میں حالات

ذرا بہتر ہوئے تو پھر خیال آیا کہ کوشش کریں شاید گھر والے اجازت دیدیں ڈرتے ڈرتے والد صاحب کے سامنے ٹیلیگرام رکھدیا، نتیجہ ظاہر تھا فوراً انکار ہوگیا دماغ پریشان کہ مستقبل خطرے میں ہے، تھوڑی دیر بعد حضرت مفتی صاحب تشریف لائے مجھے افسردہ دیکھ کر پوچھا کیا بات ہے حکیم صاحب نے پوری بات بتائی، فوراً فرمایا کہ حکیم صاحب جانے دیجئے یہ وہاں زیادہ محفوظ رہے گا اور نہ جانے کن الفاظ میں حکیم صاحب کو سمجھایا کہ وہ نیم راضی ہو گئے میں نے اسی وقت جاکر جہاز کی سیٹ بک کرائی اور اگلے دن سری نگر روانہ ہوگیا۔ مفتی صاحب کا یہ وہ احسان تھا جسے میں کبھی نہیں بھول سکوں گا جب بھی میں دہلی آتا مفتی صاحب سے ضرور ملاقات ہوتی خیریت پوچھتے، حالات پوچھتے اور دعاؤں سے نوازتے ۱۹۷۰ء میں ڈاکٹر بن کر جب واپس آیا تو مفتی صاحب بہت خوش ہوئے اور فرمایا کہ اب یہیں مطب کرلو میرا بھی یہی خیال تھا، چشتی قبر پر ہی اپنے مطب کا آغاز کیا جسکی افتتاحی تقریب میں مفتی صاحب مولانا قاری محمد طیب صاحب کے ہمراہ پیش پیش تھے، اس کے بعد بھی جب ملاقات ہوتی نہایت شفقت کے ساتھ خیریت پوچھتے اور دعائیں دیتے، تب ہی ایک روز مجھے معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کو گاؤٹ (GOUT) کی تکلیف ہے اور وہ کچھ دوائیں استعمال کرتے ہیں ایک روز مجھے فرمانے لگے یہ دوائیں عرصہ سے استعمال کر رہا ہوں جسم میں خشکی ہونے لگی ہے، میں نے ان کی سب دوائیں بند کرکے صرف ایک کیپسول تجویز کر دیا کچھ دن بعد ملاقات ہوئی تو افاقہ بتایا اس کے کچھ دن بعد ہی مفتی صاحب کے گھر میں سے علیل ہوگئیں، دماغی دورے پڑنے لگے ایک روز مجھے گھر پر بلایا اور فرمایا کہ ان کے لئے بھی کوئی دوا تجویز کروں میں نے دیکھنے کے بعد ان کے لئے بھی نسخہ لکھدیا، الحمدللہ افاقہ ہوا اور وہ دوا اخیر دم تک انکی چلتی رہی دسمبر ۸۱ء میں مفتی صاحب کی اہلیہ پر فالج کا حملہ ہوا فوراً ہی میرے پاس آدمی بھیجا کہ مطب کے بعد میں ان کو دیکھ لوں میں گھر آیا تو مفتی صاحب کو کافی فکرمند پایا۔ عام حالات میں مفتی صاحب کے چہرے

سے کبھی یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ وہ پریشان ہیں،

بہرحال انکو دیکھنے کے بعد کچھ دوائیں تجویز کی گئیں کچھ ٹسٹ کرائے گئے اس فالج میں ان کا چہرہ اور آدھا جسم مفلوج ہو چکا تھا ایک ہفتہ بعد پھر مجھے فون کیا کہ ابھی تک کچھ زیادہ فائدہ نہیں ہے میں نے کہا کہ اس میں تقریباً چھ ہفتہ بعد صحیح شکل سامنے آئے گی علاج ہوتا رہا اور کافی حد تک افاقہ ہو گیا۔ چار ہفتہ بعد میں نے بتایا کہ اب انھیں (PHYSIO THERAPY) ایکسرسائز کی ضرورت ہے کچھ دن تو ایک ڈاکٹر صاحب آئے مگر مریض کی دماغی کیفیت کی وجہ سے وہ کچھ نہ کرا سکے اس لئے وہ سلسلہ پھر بند ہو گیا اور اہلیہ صاحبہ مستقل بستر سے لگ گئیں اس کے بعد سے ہی مفتی صاحب کو اکثر افسردہ دیکھا گیا یہ غالباً ۲۴ فروری ۱۹۸۲ء کا واقعہ ہے کہ مفتی صاحب کسی کانفرنس سے واپس آرہے تھے کہ لکھنؤ اور اعظم گڑھ کے درمیان کسی جگہ پر اچانک فالج کا حملہ ہوا اور طبیعت کافی بگڑ گئی لکھنؤ میں انکو گاڑی سے اتار کر فوراً مقامی ہسپتال میں داخل کر دیا گیا وہاں ڈاکٹروں نے ایمرجنسی ادویات دیکر دہلی میں ٹرانسفر کا مشورہ دیا چنانچہ مفتی صاحب کو اگلے روز دہلی کے جی بی پنٹ ہسپتال میں داخل کر دیا گیا جہاں ڈاکٹروں کی ٹیم نے معائنہ کے بعد بہت سے ٹیسٹ لئے اور نہایت تندہی سے علاج کیا، ۱۰ دن کے بعد حالت قدرے بہتر ہو گئی تو ان کو گھر واپس لے آیا گیا مفتی صاحب ہسپتال میں رہنے سے گریز کرتے تھے گھر آنے کے بعد پھر وہ میرے علاج میں آگئے۔ گھر پر ہی ایکسرسائز کا انتظام کیا گیا ایک ماہ بعد الحمدللہ زبان اس قابل ہو گئی کہ الفاظ صاف سمجھ میں آنے لگے رفتہ رفتہ ہاتھ بھی ٹھیک ہو گئے مگر ٹانگوں کی کمزوری رہی جس پر اکثر کہا کرتے بس ٹانگیں اور ٹھیک ہو جائیں تو میں بالکل ٹھیک ہوں، اس فالج میں مفتی صاحب غالباً ڈیڑھ برس صاحب فراش رہے ایک روز گھر سے فون آیا کہ میں آکر دیکھ لوں ناک میں کچھ تکلیف بتاتے ہیں میں نے دیکھا کہ بائیں آنکھ کی جڑ میں ایک چھوٹا سا دانہ ہے۔ دو تین روز دوائیں دیں مگر وہ دانہ تیزی سے بڑھتا گیا اسکی

شکل سے اندازہ ہوا یہ کوئی معمولی دانہ نہیں، بلکہ کینسر کی ابتدا ہے میں نے مفتی صاحب کے صاحبزادے عبدالرحمن عثمانی سے اپنے خدشہ کا اظہار کیا کہ اس کا ٹیسٹ ہونا چاہئے اگلے دن میڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں دکھایا گیا جہاں انھوں نے خون کے مختلف ٹیسٹ لئے اور اسکی BIOPSY لی گئی جس سے بدترین خدشات درست ثابت ہوئے اور کینسر تجویز کیا گیا اور فوری طور پر بجلیاں لگوانے کا مشورہ دیا گیا، گھر والوں کا خیال تھا کہ ابھی بجلیاں نہ لگوائی جائیں مگر میرے مشورہ پر سب راضی ہو گئے نہایت پابندی کے ساتھ بجلیوں کا کورس پورا کیا گیا اس کے بعد انجکشن تجویز کئے گئے جن کے لئے ہفتہ میں ایک بار میڈیکل انسٹی ٹیوٹ جانا ہوتا تھا اس تمام علاج سے مفتی صاحب کی صحت میں خاطر خواہ فائدہ ہوا اور وہ پہلے کی طرح بشاش نظر آنے لگے تقریباً سات ماہ تک یہ علاج چلتا رہا اچانک ایک روز جسم پر تین چار جگہ چھوٹی چھوٹی گلٹیاں نظر آئیں مجھے دکھایا تو میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا کیونکہ وہ کینسر کی ـــــ (SECONDRIES) تھیں اور اس بات کی علامت تھی کہ وہ موذی مرض عارضی طور پر دب گیا تھا مگر اندر ہی اندر پھیلتا رہا پھر میڈیکل کو رجوع کیا گیا جہاں اس بات کی تصدیق ہو گئی اب سب گھر والوں کی تشویش بڑھ گئی، مختلف معالجوں سے رجوع کیا گیا، اس وقت صفدر جنگ ہسپتال میں کینسر کے سب سے بڑے معالج پروفیسر ایم رحمن تھے میں ان کے گھر پہونچا، میرے ان سے تعلقات اس زمانے سے تھے جب میں خود صفدر جنگ میں تھا، اس کے بعد ان کے گھر کبھی کبھی جانا ہوتا تھا رحمن صاحب نے تمام رپورٹیں دیکھیں اور فرمایا کہ اب اس کا اختتام قریب ہے اور تقریباً لاعلاج ہے پھر بھی فرمانے لگے جمعہ کو میرے یہاں لے آنا داخل کر کے دیکھیں کہ اور کیا کر سکتے ہیں۔ میں واپس آ گیا اگلے دن منگل تھا اچانک شام کو معلوم ہوا کہ مفتی صاحب کی طبیعت بگڑ گئی ہے فوراً پہونچا دیکھا کہ بیہوش ہیں اور کچھ گلٹیاں گلے میں بھی پھیل گئی ہیں جس کی وجہ سے کوئی چیز حلق سے نہیں اتر رہی ہے انجکشن کے بعد کچھ حالت سنبھلی مگر نیم بیہوشی کی کیفیت رہی، میں نے Ryles ٹیوب

منگا کر ناک کے راستے سے معدہ میں داخل کر دیا جس سے رقیق غذا دی جانے لگی رات تقریباً ۱۱ بجے تک میں وہاں موجود رہا ان کے سب لڑکے اور رشتہ دار اور مفتی صاحب کے عقیدت مند وہاں جمع ہو گئے گھر والوں کی خواہش تھی کہ اب ہسپتال نہ داخل کرایا جائے بلکہ گھر کو ہی ہسپتال بنا دیا جائے چنانچہ ان کو گھر پر ہی آکسیجن اور گلوکوز دیا جانے لگا اگلے دن ۱۱ مئی ۸۲ء بدھ کو صبح طبیعت خراب ہی رہی، تقریباً ۱۲ بجے دوپہر پھر ایک سیاہ رنگ کی قے ہوئی جس کے بعد حالت مزید بگڑنی شروع ہوئی، مطب کے بعد پھر پہونچا، پھر کچھ انجکشن دیئے اور ان کی حالت میں افاقہ دیکھکر گھر واپس آگیا، پندرہ منٹ بعد ہی پھر اطلاع آئی کہ پھر طبیعت بگڑ رہی ہے فوراً پہونچا تو دیکھا کہ مفتی صاحب ہم سب کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جا ملے۔ میں نے سب نلکیاں ان کے جسم سے الگ کیں اور انکو سیدھا لٹا کر چادر ڈال دی ہر طرف کہرام تھا گھر والے سب برداشت کر رہے تھے مگر باہر شور تھا تھوڑی دیر بعد بازار گلی کوچے سیاہ حاشیئے والے پوسٹروں سے ماتم کناں ہو گئیں ہر شخص افسردہ تھا ماحول افسردہ تھا گھر والے نہلانے اور دوسرے انتظامات میں مصروف ہو گئے اگلے روز صبح سویرے جامع مسجد میں نماز جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد لاکھوں لوگوں کے کاندھوں سے گذر کر مفتی صاحب کو سپرد خاک کر دیا گیا۔ یہی دنیا کا قاعدہ ہے انسان پیدا ہوتا ہے زندگی گذارتا ہے اور چلا جاتا ہے اسی کو دیکھکر کسی نے کہا ہے ؎

موت اسکی ہے کرے جس کا زمانہ افسوس + ورنہ دنیا میں سبھی آئے ہیں مرنے کیلئے

آج مفتی صاحب ہم میں نہیں انکی نرم اور شائستہ گفتگو ہر وقت انکی یاد دلاتی ہے جب ان کا تصور آتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مفتی صاحب مخاطب ہیں اور کہہ رہے ہیں

"کہئے مزاج تو اچھے ہیں"

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن عثمانیؒ

پر چند بعض خطوط کی روشنی میں

★ مولانا حکیم محمد عرفان الحسینی ★

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں: "موت سے کسی کو مفر نہیں" لیکن جو لوگ ملّی مقاصد کی تائید و حصول میں تادم آخر کام کرتے رہتے ہیں وہ کتنی ہی طویل عمر کیوں نہ پائیں ان کی وفات قبل از وقت اور تکلیف دہ محسوس ہوتی ہے" (گنجہائے گرانمایہ)

حضرت مفتی عتیق الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ پر یہ جملہ مکمل طور پر صادق آتا ہے مفتی صاحب نے اپنی زندگی ملک و ملّت کی خدمت ہی کے لئے وقف کر دی تھی۔

حضرت مفتی صاحب ایک بڑے باپ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن عثمانی (جن کے قلم سے ایک لاکھ اٹھارہ ہزار فتوے لکھے گئے) کے بڑے بیٹے تھے، مفتی صاحب کی پیدائش ۱۳۱۹ھ ہجری میں دیوبند میں ہوئی، تاریخی نام "ظفر الحق" ہے، ۹ سال کی عمر میں قرآن شریف حفظ کیا، شروع سے اخیر تک دار العلوم دیوبند میں تعلیم حاصل کی اور ۱۳۴۱ھ ہجری میں فارغ التحصیل ہوئے دو سال وہیں رہے، پھر دار العلوم اسلامیہ ڈابھیل گجرات چلے گئے وہاں پانچ سال تک افتاء اور تدریس کے فرائض انجام دیئے، ۱۹۳۰ء میں باقاعدہ سیاسی زندگی شروع کی اور انڈین نیشنل کانگریس کی تحریک نمک سازی کے زمانہ میں سیاسی دلچسپی کے باعث ڈابھیل چھوڑ دیا اس دور میں ان کے دو اہم فتوے شائع ہوئے جنھوں